مشاہیرِ سرحد

عبدالقیوم



حضرت اخوند صاحبؒ سوات

آپ کا اسمِ نامی عبدالغفور اور والد کا نام عبدالوحید تھا۔ سوات کے علاقہ شامیزے کے موضع جبڑی میں ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی قوم صافی کہلاتی تھی، جس کا سادات سے گہرا تعلق تھا۔ بچپن ہی سے آپ کو دینی تعلیم کا شوق رہا، جو عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیلِ تعلیم کے لیے ضلع مردان میں گوجر گڑھی علاقہ یوسف زئی میں تشریف لائے جہاں مولانا عبدالحکیم سے، جو اپنے دور کے مشہور عالم تھے مزید رُوحانی فیض حاصل کیا اور پھر کچھ عرصہ جمکنی (پشاور)، اور کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ میں گزارا۔ اس کے بعد پشاور میں گنج والے حافظ حضرت جی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تقریباً چار برس پشاور میں رہ کر اُن سے سلوک و طریقت میں تعلیم پائی۔ پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد تکمیل کی سند حاصل کی۔

اس کے بعد آپ شیخ المشائخ صاحبزادہ محمد شعیب ساکن تورڈھیری کی خدمت میں پہنچے جو اپنے زمانے کے بے مثال و نامور صاحبِ طریقت بزرگ تھے اور جن سے اُن کے مرید چار سلسلوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حضرت اخوند صاحبؒ نے سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہو کر اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اور تور ڈھیری میں ایک جھونپڑی میں بارہ سال تک مجاہدہ اور ریاضت کرتے رہے۔ عبادت سے جو وقت بچ جاتا اسے سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج و اشاعت میں صرف کرتے۔ اس کے علاوہ لوگوں سے شرعی احکام کے مطابق عمل کروانا، بدعات و رسوماتِ بد کو ترک کروانا، حقوقِ یتامیٰ کا تحفظ اور عقدِ بیوگان کرانا، آپ کے خاص مقاصد تھے۔ آپ کے قول و فعل میں تطابق دیکھ کر لوگ بے حد متاثر ہوئے اور آپ کے خلوص و دینداری کی وجہ سے ہزاروں لوگ جوق در جوق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ آپ نے مولانا محمد شعیب کی وفات کے بعد کچھ عرصہ ہنڈ کے متصل موضع بیکی میں دریائے سندھ کے کنارے قیام کیا اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر موضع سلیم خان پہنچے، اور یہیں پہلی مرتبہ لوگوں نے آپ کو اخوند کے لقب سے خطاب کیا۔

حضرت اخوند صاحبؒ نہ صرف خدا رسیدہ بزرگ تھے بلکہ ایک بلند پایہ مدبر، عظیم المرتبت قائد اور سرفروش مجاہد بھی تھے۔ جن کے غیر فانی کارناموں سے قرونِ اولیٰ کے غازیانِ اسلام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب سید احمد شہید بریلویؒ نے سکھوں کے خلاف جو پنجاب کے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھا رہے تھے علمِ جہاد بلند کیا تو انھوں نے سب سے پہلے سرحد کا دورہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سرحد سکھوں کا مضبوط ترین اور ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے، اور اگر اس پر قبضہ جما لیا جائے تو پھر سارے پنجاب میں سکھوں کے قدم جم نہ سکیں گے۔ چنانچہ اس غرض سے وہ حضرت اخوند صاحبؒ سے بھی ملے۔ جنھوں نے تن من، دھن سے اپنی اعانت و تعاون کا یقین دلایا۔ کچھ دنوں بعد حضرت سید احمد بریلویؒ کے زیر قیادت مجاہدین کے لشکر نے ایک ہی یلغار میں پشاور اور اس کے آس پاس کا علاقہ فتح کر لیا اور سکھ پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پشاور فتح کرنے کے بعد مجاہدین نے اسلامی

بنیادوں پر معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کی اور جو خرابیاں پٹھانوں میں بڑی مدت سے رائج تھیں انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ حضرت اخوند صاحبؒ نے اس سلسلے میں بڑی سرگرمی اور خلوص سے سید صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ گو ان کو ہندوستانی مجاہدین کے بعض فروعی عقائد سے اختلاف تھا۔

لیکن انقلابِ زمانہ کا کیا مداوا! بدقسمتی سے حضرت اخوند صاحبؒ نے غلط فہمی کی وجہ سے خان ہنڈ کو حضرت سید صاحبؒ کا طرف دار و حامی سمجھا حالانکہ یہ کم بخت اسلام کے پردے میں سکھوں کے ہاتھ بک چکا تھا اور سرحدی مسلمانوں کے خلاف اس نے ایک خفیہ تحریک چلا رکھی تھی۔ جب حضرت اخوند صاحبؒ کو یہ علم ہوا کہ سید صاحبؒ سکھوں کے مضبوط ترین پہاڑی قلعہ بالاکوٹ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھوں نے اس خیال سے خان ہنڈ کو یہ راز بتا دیا کہ وہ اپنے وسائل سے کام لے کر سید صاحبؒ کو اس مہم کو سر کرنے میں مدد دے گا۔ خان ہنڈ نے سکھوں کو فوراً سید صاحبؒ کے ارادے سے مطلع کر دیا۔ جوں ہی حضرت سید صاحبؒ اپنے رفیقِ خاص حضرت اسماعیل شہید اور مجاہدین کے لشکر کے ہمراہ بالاکوٹ پہنچے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انھیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا جو حضرت امامِ حسینؓ کو میدانِ کربلا میں پیش آئے تھے۔ جس طرح حضرت امام حسینؓ کے ورود سے پہلے یزید کا لشکر دریائے فرات کے کنارے صف آرا ہو کر جنگ پر کمربستہ ہو چکا تھا بالکل اسی طرح مجاہدین کی بے خبری میں بالاکوٹ کی نواحی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر مجاہدین کے آنے سے پہلے توپیں اور مشین گنیں نصب کی جا چکی تھیں۔ ایسی حالت میں راہِ فرار اختیار کرنا یا ہتھیار ڈال دینا سنتِ رسولِ اکرمؐ سے انحراف کے مترادف اور اسلامی شیوۂ سرفروشی سے بعید تھا۔ چنانچہ مجاہدین میدانِ وغا میں کود پڑے اور سینکڑوں سکھوں کو واصلِ جہنم کرتے ہوئے

بالآخر خود بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اگر خان ہنڈ اس نازک موقع پر غداری نہ کرتا تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر ے

من از بیگانہ گاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

برِ صغیر میں غلبۂ اسلامی کے لیے پہلی چلائی ہوئی یہ عوامی تحریک ناکام ہو گئی تو حضرت اخوند سوات کو بے پناہ صدمہ ہوا۔ ان کا صبر و سکون چھین گیا اور وہ رات دن انگاروں پر لوٹتے رہے۔ اس زمانے میں وہ سوات میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے خان ہنڈ کو جو بروقت اطلاع دی تھی اس افسوس ناک غلطی پر انھیں اتنی ندامت سی ہوئی کہ زندگی بھر اندر ہی اندر سلگتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چنانچہ خفت و ندامت کے اس گہرے احساس سے پیچھا چھڑانے کے لیے آپ چوبیس سال کوہستان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے۔ کسی جگہ قرار نہ آتا تھا۔ آخر کار ۱۸۳۵ء میں اپنے وطن جبڑی میں آئے۔ وہاں کچھ دن رہنے کے بعد موضع رنگیلا کا رُخ کیا۔ پھر وہاں کچھ دن قیام کے بعد موضع ہوڈی گرام کے قریب غازی بابا کے مزار کے متصل قیام کیا۔ وہاں سے مرغزار تشریف لائے اور موضع سیدو شریف میں قبیلہ کوزئی میں شادی کی اور دو صاحبزادے عبدالحنان گل اور عبدالخالق میاں گل پیدا ہوئے جن میں موخر الذکر سوات کے بادشاہ تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے میاں گل عبدالودود تخت نشین ہوئے جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں (۱۹۴۹ء) تاج و تخت اپنے لڑکے شہزادہ محمد عبدالحق جہاں زیب خان کے حوالے کر دیا تھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہندوستانی مجاہدین کی شکست کے بعد حضرت

اخوند صاحب ہمیشہ اُداس اور بجھے بجھے سے رہتے تھے۔ مشاہدہ و مراقبہ اور ذکر و فکر سے فرصت ملتی تو رسوماتِ بد اور بدعات کے خلاف عملاً جہاد کرتے۔ کچھ عرصہ بعد سرحد میں سکھوں کا نام و نشان مٹ گیا مگر اب اُن کی جگہ انگریز پشاور پر قابض ہو گئے اور ملکوں اور خوانین کی خانہ جنگی اور باہمی اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سرحد کے دیگر علاقوں میں بھی اپنی فتوحات کا جال بچھانے لگے۔ حضرت اخوند صاحب رحؒ کو اس خطرہ کا بروقت احساس ہوا۔ انھیں اس میں مطلق شک نہ تھا کہ اگر سوات میں قبائلی لوگوں میں بدستور خانہ جنگی اور انتشار رہا تو انگریزوں کے ناپاک منصوبوں سے اس علاقے کو بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ اس غرض سے انھوں نے سوات میں مسلمانوں کی تنظیم و اتحاد کی تحریک چلائی اور یہ ان ہی کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ یہاں لوگوں نے متحد ہو کر سید اکبر شاہ[1] کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ عوام سید اکبر کے انتخاب سے پہلے حضرت اخوند صاحب رحؒ کے ہاتھ پر بیعت امارت کرنا چاہتے تھے مگر انھوں نے امارت کا بارِ گراں اُٹھانا مصلحت کے خلاف سمجھ کر سید اکبر شاہ ہی کو بادشاہِ سوات تسلیم کر لیا اور خود منصبِ شیخ الاسلام پر فائز ہوئے۔ آپ تمام جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ اسلامی شریعت کی روشنی میں کرتے جس کے نتیجے میں سوات میں امن و امان بحال ہو گیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا زرین اسلامی اصول عملی طور سے رائج ہو گیا۔ سات برس حکومت کر کے سید اکبر شاہ نے ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ وہ سال تھا جب کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا اعلان ہو چکا تھا اور اس جنگ کی خبریں وقفے وقفے سے سرحد پہنچ رہی تھیں۔

---

[1] سید اکبر شاہ حضرت سید علی ترمذی المعروف بہ پیر باباؒ کی اولاد سے تھے۔

سیدّ اکبر شاہ کی وفات کے بعد سوات میں خانہ جنگی کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔ انگریزوں کو سیدّ اکبر شاہ کے انتقال کی خبر سُن کر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ سرحد میں امارتِ شرعیہ کا قیام اُن کی استعمار پرستی کے لیے ایک سنگین خطرہ تھا۔ سر ہربرٹ ایڈورڈ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز سیدّ اکبر شاہ سے کتنے خوف زدہ تھے:

"اگر سوات میں شرعی حکومت اور جنگ جُو قبائل کا سردار زندہ ہوتا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔"

سیدّ اکبر شاہ کی وفات کے بعد سوات و بنیر کی سرسبز و شاداب وادیاں طوائف الملوکی اور افراتفری کا شکار ہو گئیں۔ اس صورتِ حال سے حضرت اخوند صاحبؒ مضطرب ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ سیدّ اکبر شاہ کا فرزند مبارک شاہ تقریباً چھ مہینے تک قبائل کو متحد کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر شورش پسند قوتوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اب صرف اخوند صاحبؒ ہی پر سواتیوں کی نگاہیں مرکوز تھیں مگر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انھیں منصبِ امارت کسی صورت میں بھی منظور نہ تھا۔ چنانچہ مبارک شاہ اور اخوند صاحبؒ کے صاحبزادے میاں گل عبدالخالق میں حصولِ اقتدار کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ لیکن اخوند صاحبؒ نے بالآخر اپنے صاحبزادے کو دعوئ امارت سے دست کش ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ ذاتی طور سے اس کشمکش سے علیحدگی ہی کو عوام کے مفاد میں ضروری سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ امارت قبول کیے بغیر بھی وہ ملک و قوم کی گرانقدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ عوام کے دلوں پر ان کی حکمرانی تھی اور شیخ الاسلام کی حیثیت سے اُن کے احکام کی تعمیل ہر جگہ برضا و رغبت ہوتی تھی اور ہر شخص اُن کا شرعی فیصلہ اور فتویٰ دل و جان سے قبول کرتا تھا۔

سوات میں نظامِ حکومت کے تعطل اور اس کے نتیجے میں طوائف الملوکی

کی خبر سُن کر انگریزوں نے سوات کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس موقع پر حضرت اخوند صاحبؒ نے ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اس جنگ میں شریک ہونے کی غرض سے سیدو شریف سے روانہ ہو کر منگورہ پہنچے، جہاں نمازِ جمعہ کے بعد ایک خطبہ دیتے ہوئے اور جہاد کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا "یاایھا الذین امنو اصبروا وصابروا ورابطوا قف واتقوا اللہ لعلکم تفلحون" (آل عمران ع ۲۰)

(اے مُسلمانو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو اور آپس میں مل کر رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو) انھوں نے اس خطبے کے اختتام پر یہ اعلان بھی کیا کہ انگریز اگر ہمارے مُلک پر قابض ہو گئے تو میں اس مُلک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا"۔ خطبے سے فارغ ہو کر آپ نے قابلِ اعتماد قبائلیوں اور مخلص ترین مُریدوں پر مشتمل ایک لشکرِ جرار ترتیب دیا جو ان کی زیرِ قیادت میدانِ جنگ میں پہنچ گیا اور خُدا سے نصرت کی دُعا مانگتے ہوئے دُشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی قاریوں نے نہایت خوش الحانی سے سورۂ جہاد (انفصال) کی تلاوت شروع کر دی۔ بجگوتن شعرا نے اپنے ولولہ انگیز کلام سے لشکرِ اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اک آگ سی لگا دی۔ مجاہدینِ اسلام نے نہایت بے جگری سے انگریزوں پر حملہ کیا اور کئی گھنٹوں کی دست بدست جنگ کے بعد ان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس جنگ کا نام جنگِ امبیلہ ہے۔

چند دنوں بعد حضرت اخوند صاحبؒ کی زیرِ قیادت لشکر اسلام کڑا کڑ کے مورچے پر حملہ کر کے انگریزوں کی فوج کی صفوں میں جا گھسا اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ اس مورچے پر اتنی خونریز اور شدید لڑائی ہوئی کہ اس جگہ کا نام ہی قتل گڑھ پڑ گیا۔ مجاہدین نے اس معرکے میں بے پناہ شجاعت اور غیر معمولی بسالت کا مظاہرہ کیا۔ حضرت اخوند صاحبؒ گھوڑے پر سوار ہو کر بہ نفسِ نفیس میدانِ

جنگ کے کونے کونے کا چکر لگاتے اور شمع حق پر جان چھڑکنے والے مجاہدین میں سے ہر ایک سے یہی کہتے کہ بڑھتے جاؤ مجاہدو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ آپ وقفے وقفے سے خُدا کے حضور یہ دُعا بھی مانگتے:

الٰہی بدہ فتح اسلام را   بکن غرق خصمِ بد انجام را

امبیلہ میں شکست کھانے کے باوجود انگریزوں نے چند دنوں بعد پھر اعلانِ جنگ کر دیا۔ انھیں تجربہ ہو چکا تھا کہ توپ و تفنگ سے افغانوں کو مطیع کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے جنگ چھیڑنے سے پیشتر اُنھوں نے مکاری، رشوت اور پھوٹ ڈالنے کے حربوں سے کام لے کر دیر اور بنیر کے خوانین کو خرید لیا۔ نتیجتہً باجوڑ اور دیر کے قبائلی ہمت ہار کر واپس ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت اخوند صاحبؒ کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی وہ غیر ملکی استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ مگر وہ تنِ تنہا کیا کر سکتے تھے۔ مجاہدین منتشر ہو چکے تھے اور اپنوں کی غداری کی وجہ سے انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس پریشان حالی میں آپ سیدو شریف تشریف لے گئے اور جب تک زندہ رہے نہ صرف صوبہ سرحد میں، بلکہ کابل، ہرات، غزنی، ہندوستان اور عرب و عجم میں اپنے خلفاء و مُریدین تبلیغِ اسلام کے لیے بھیجتے رہے۔ جنگی مساعی سے ان سارے مُلکوں میں دینِ مصطفوی کو فروغ حاصل ہوا۔ ان کے لنگر سے محتاجوں اور مسکینوں کو ہر وقت کھانا ملتا تھا۔ نادار اور یتیم لڑکیوں کی شادی اپنی گرہ سے کرواتے تھے۔ حضرت اخوند صاحبؒ نے ۲۱ جنوری ۱۸۷۷ء میں سیدو شریف میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ ان کے مزار پر ہر سال ہزاروں عقیدتمند حاضر ہو کر روحانی فیوض سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے موضع سیدو، سیدو شریف کہلاتا ہے۔

تذکرہ

سرفروشان

صوبہ سرحد

محمد شفیع صابر

یونیورسٹی بک ایجنسی
خیبر بازار - پشاور

اخون صاحب سوات

۲۳ راگست ۱۸۶۳ء کا گرم دن تھا درا امبیلہ کا دشوار گزار پہاڑی درّہ، ہندوستان بھر کے طول و عرض سے برطانوی فوج کے دستے دھڑا دھڑ محاذِ جنگ پر پہنچ رہے تھے۔ ایک طرف برطانوی سلطنت کے سب مادی وسائل تھے، دوسری طرف سرزمینِ یوسف زئی کے بے سروسامان مجاہد ——— ایک طرف سر نیول چیمبر لین جیسا آزمودہ کار اور جہاندیدہ جرنیل تھا دوسری طرف ایک درویش خدا مست حضرت اخون عبد الغفور آف سوات۔ ایک طرف توپ و تفنگ سے مسلح، انتہائی منظم فرنگی فوج اور دوسری طرف وہ مخلص اور ایثار پیشہ رضاکار جو صرف اللہ کے آسرے پر، شوقِ شہادت سے بے تاب دشمن کے مقابلے پر اترے تھے۔ انگریز نے برصغیر کی چھاؤنیوں سے چن چن کر اپنے تمام سپاہی اس سرحدی مہم پر بھجوا دیے تھے یہاں تک کہ گورنر پنجاب کے ۴۲ سپاہیوں پر مشتمل باڈی گارڈز کے علاوہ ایک سپاہی بھی پیچھے نہیں رہ گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ختم ہوئی تو انگریز نے اپنی ساری توجہ سرزمینِ یوسف زئی کی تسخیر پر مرکوز کر دی۔ فرنگی سامراج اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو مہابن کے پہاڑ پر واقع مرکزِ مجاہدین ملکا کو تباہ کرنا تھا۔ دوسرا مقصد سوات اور بونیر کے سرفروشوں کو سبق سکھانا تھا کہ آئندہ وہ مجاہدین کی امداد سے باز رہیں۔ کبھی انگریز افسر شکار کھیلنے کی آڑ میں آتے اور علاقے کا جائزہ لیتے، کبھی

سیاسی سازشوں کا جال پھیلاتے کہ یوسف زئی مجاہدوں میں اختلافات کو ہوا دیں۔

کشمکش جاری تھی۔ مجاہدین سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے، جب کبھی موقع ملتا وہ کسی فرنگی کیمپ پر دھاوا بولتے اور دشمن کو خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ کر واپس ستھانہ پہنچ جاتے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں فرنگی نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لشکر جرار جمع کیا اور ستھانہ کے مرکز مجاہدین کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جواب میں ۷ ستمبر ۱۸۶۳ء کو تحریک مجاہدین کے جیالوں نے گائیڈ رسالہ کے ایک کیمپ پر شب خون مارا اور دشمن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

یہ معرکے جاری تھے۔ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ بونیر اور سوات پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ایسے میں امیر المجاہدین مولوی محمد عبداللہ کو روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ وہ غوث زماں حضرت اخون صاحب سوات کی خدمت میں پہنچا اور اسلام کے مقدس نام پر ان سے اعانت اور رہنمائی کا طالب ہوا۔ اخون صاحب جہاں ایک طرف عابد شب زندہ دار اور تارک الدنیا بزرگ تھے وہیں اپنے زمانے کے نامور مجاہد بھی۔ انھوں نے امیر المجاہدین کی اپیل قبول کر لی اور جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کر دیا ___ فرنگی نہیں جانتا تھا کہ حضرت اخون صاحب سوات کے اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کون مسلمان تھا جو اس پاکباز ہستی کے اعلانِ جہاد کے بعد خاموشی سے گھر میں بیٹھا رہتا۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ ساٹھ ہزار مردانِ کار سر بکف باندھ کر فرنگی کے خلاف میدان میں اتر پڑے۔ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں اس قبائلی لشکر کی تفصیل یوں دی ہے :۔

حسن زئی دو ہزار، اکازئی ایک ہزار، جعفر زئی چھ ہزار، مداخیل
چار ہزار، امازئی ڈیڑھ ہزار، گدون چار ہزار، خدا خیل دو ہزار
بونیر وال بارہ ہزار، بابوڑی تین ہزار، رانی زئی دو ہزار، اہل دیر
چھ ہزار، سواتی دس ہزار، دوسرے لوگ سات ہزار۔

جہاد امبیلہ نے فرنگی کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ بالآخر ۱۸ ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سر نیول چیمبرلین سات ہزار مشّاق فوجی لے کر امبیلہ کی طرف بڑھا۔ وہ ان دنوں سرحدی مہمات کا سب سے زیادہ تجربہ کار جرنیل تھا۔ توپ خانہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ پہاڑی علاقے کی جنگ تھی۔ رسد رسانی کے لیے چار ہزار خچر اس کے ساتھ تھے۔ سارے پنجاب سے اتنی ہی تعداد میں خچر اسے مل سکے تھے۔ ڈھونڈھنے سے بھی کوئی خچر اب کسی جگہ باقی نہ رہا تھا۔

ہر روز فرنگی کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ صوبہ سرحد کی تمام شاہراہوں پر فوجی سپاہی ہی سپاہی نظر آتے تھے۔ قبائلی مجاہد سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ ایسے میں فرنگی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ چیمبرلین ہیڈ کوارٹر کو تار پر تار دیتا کہ مزید کمک بھیجی جائے ـــــ چودہ نومبر تک دھڑا دھڑ فرنگی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا لیکن اس پر بھی جنرل چیمبرلین کو پیش قدمی کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اس کی ساری فوج امبیلہ کی گھاٹی میں محصور تھی۔ مجاہدین پہاڑی مورچوں سے ان پر آگ برسا رہے تھے۔ ۱۸ ر نومبر کو اپنی بے سروسامانی کے باوجود مجاہدین نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ایک سو چودہ (۱۱۴) افراد کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ دوسرے دن قبائلی سرفروش پھر شہادت کی تمنا دلوں میں لیے فرنگی لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ اس معرکہ میں

۱۲۸ فرنگی ہلاک ہوئے۔ اور خود جنرل سرنیول چیمبرلین بھی مرتے مرتے بچا —— دوسرے ہی دن اس نے ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کر دیا کہ متواتر ایک ماہ سے دن رات ڈیوٹی دے کر لشکر کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ اس لیے تازہ دم کمک کا آنا ناگزیر ہو گیا ہے —— صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھ کر انڈین افواج کا کمانڈر اِن چیف خود کلکتہ سے لاہور پہنچا اور ذاتی طور پر محاذِ جنگ کی نگرانی کرنے لگا —— ساری سلطنت کی بہترین فوجیں محاذ امبیلہ پر پہنچ گئیں —— اس کے باوجود انگریز کو حوصلہ نہ ہوا کہ آگے بڑھے۔ مقابلے میں بے سروسامان قبائلی مجاہد تھے، جن کے پاس صرف چند دن کے لیے سوکھی روٹیاں تھیں اور بس۔ ادھر موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ مجاہدین خیموں اور کمبلوں کے بغیر ساری ساری رات کھلے آسمان تلے گزارتے تھے۔ ایسے ایسے خطرناک مورچے بھی تھے جن پر کبھی مجاہدین کا قبضہ ہو جاتا کبھی فرنگیوں کا —— یہ مورچے "قتل گاہ" تھے —— جہاد جاری رہا لیکن جیسا کہ سول سروس کے رکن ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے تسلیم کیا ہے۔ "جو کام ہماری سنگینوں سے نہ ہو سکا ہماری ڈپلومیسی نے کر دکھایا" کمشنر پشاور نے تجوریوں کے منہ کھول دیے۔ کمزور لوگوں اور قبیلوں کو بے دریغ روپیہ دے کر ساتھ ملا لیا گیا۔ کئی ایک کو اس پر رضامند کیا گیا کہ وہ چپکے سے محاذ کو چھوڑ کر گھروں کو واپس چلے جائیں۔ انگریز کی مایوسی اور بدحواسی کا یہ حال تھا کہ متواتر تباہی کی خبریں سُن سُن کر وائسرائے لارڈ ایلگن بیمار پڑ گیا اور بالآخر دنیا ہی سے چل بسا۔

۲۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء تک یہ خونیں معرکے جاری رہے۔ اس عرصہ میں بونیر کے زید اللہ خان اور دوسرے چند سرکردہ افراد کو فرنگی نے صلح پر رضامند کر لیا۔ اس صلح نامہ کی رُو سے کچھ انگریز افسر زید اللہ خان کے ہمراہ مجاہدین کے مرکز ملکا

گئے اور چند جھونپڑیوں کو آگ لگا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ یہ فرنگی دستہ اس کارروائی کے فوراً بعد واپس اپنی چھاؤنی میں پہنچ گیا —— غزا میں سینکڑوں مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ تاہم فرنگی لشکر کو بھی بے اندازہ نقصان پہنچا۔ اس کے مدتوں بعد بھی فرنگی کو یہ یارا نہ ہوا کہ سوات، بونیر یا باجوڑ کا رخ کرے۔ یہ سرحدی علاقے جس طرح روزِ اول سے آزاد تھے آزاد ہی رہے۔

جہادِ امبیلہ کے روحِ رواں حضرت اخون عبدالغفور صاحب علیہ الرحمۃ تھے۔ جن کی روحانی عظمت کا پھریرا آج بھی لہرا رہا ہے۔ وہ فقیر تھے لیکن انھوں نے شہنشاہوں کے منہ پھیر دیے۔ ان کی برکت اور حسنِ عمل سے سارے قبائل متحد و متفق ہو گئے اور انھوں نے اتنے زبردست دشمن کو عبرتناک سزا دی۔ اہل سوات و بونیر اس وقت بھی ان کی برکات سے متمتع ہوئے اور آج بھی ان کے فیوض سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی عظیم ہستیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

غوث سوات حضرت اخون صاحب کا نام نامی عبدالغفور ہے۔ وہ ۱۷۸۴ء میں علاقہ شامیزئی کے گاؤں "جبڑی" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالواحد تھا۔ وہ صافی مہمند قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ شروع ہی سے ان کا رجحان دین کی طرف تھا۔ پرہیزگاری اور تقویٰ میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھے، قبائلی علاقوں میں ان دنوں دینی مدرسے بہت کم تھے۔ اس لیے اخون صاحب کبھی ایک جگہ کے کسی عالمِ دین سے استفادہ کرتے کبھی دوسرے سے۔ تلاشِ علم

میں وہ پشاور بھی آئے اور اپنے دور کے مشہور عالم دین حافظ محمد عظیم (گنج والوں) کی شاگردی میں چار سال گزارے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے پشاور کی مشہور روحانی شخصیت میاں غلام محمد عرف حضرت جیؒ سے بھی فیض پایا۔ پھر چمکنی میں حضرت محمد عمرؒ کی زیارت سے ملحقہ مدرسے میں پڑھتے رہے۔ انھوں نے تہکال بالا کے محمد یوسف الکوزئی کے پاس اور زیارت کاکا صاحب میں بھی وقت گزارا۔ دینی علوم کی تکمیل کے بعد باطنی تربیت کے لیے انھوں نے سلسلۂ قادریہ میں حضرت محمد شعیبؒ تورڈھیر کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت اخون صاحب کی استقامت کا یہ عالم تھا کہ متواتر بارہ برس تک دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع چھوٹے سے گاؤں "بکی" میں چلہ کشی کرتے رہے۔ اپنے مرشد حضرت محمد شعیبؒ کی وفات پر انھوں نے سیدو شریف سوات میں اقامت اختیار کر لی۔

حضرت اخون صاحب ایک عالم، باعمل اور صوفی باصفا ہی نہ تھے بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے۔ وہ کفر کے خلاف ہر کوشش جہاد میں شرکت کو اپنے لیے فخر تصور کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں افغانستان کے امیر دوست محمد خان نے سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت اخون صاحب کو بھی اس کار خیر میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس پر اخون صاحبؒ اپنے سینکڑوں ارادتمندوں کے ہمراہ شریک جہاد ہوئے۔

حضرت اخون صاحب سوات نے پوری کوشش کی کہ سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی غلط اور غیر اسلامی رسموں کا خاتمہ ہو۔ لوگ متحد اور متفق ہوں اور سچی اسلامی زندگی گزاریں۔ تبلیغ دین کے لیے انھوں نے کئی مساجد اور مدرسے تعمیر کیے۔ لنگر جاری کیا اور وعظ و ارشاد سے لوگوں کے قلوب کو منور کیا۔ ان کی

ساری زندگی مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف رہی۔ انہی کے کہنے پر سیدو شریف میں تمام نواحی علاقوں کے سرکردہ لوگوں کا ایک نمائندہ اجتماع (جرگہ) منعقد ہوا جس میں انہی کی تحریک پر ستھانہ کے نامور بزرگ سید اکبر شاہ کو سوات کی اسلامی مملکت کا بادشاہ منتخب کر لیا گیا اور شرعی قوانین کے مطابق ریاست کا نظم و نسق چلایا جانے لگا۔ خود لوگوں کے اصرار پر حضرت اخون صاحب کو "شیخ الاسلام" کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ واقعہ ۱۸۵۰ء کا ہے۔

۱۸۵۷ء میں سید اکبر شاہ نے وفات پائی تو سید مبارک شاہ کو ان کا جانشین بنایا گیا تاہم ان کا رجحان دین کی بجائے سیاست کی طرف زیادہ تھا اس لیے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

۱۸۶۳ء میں امبیلہ کے جہاد میں اخون صاحب سوات ہی کے کہنے پر سارے علاقے کے قبائل نے متحد و متفق ہو کر فرنگی سامراج کا مقابلہ کیا اور انگریز کو وہ سبق سکھایا کہ بالآخر اسے صلح کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اس موقع پر انھوں نے ہر طرح کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تحریک مجاہدین اور اس کے قائد مولوی محمد عبداللہ کا ساتھ دیا۔

بعد میں حضرت اخون صاحب ہی کی بصیرت اور حکمت عملی سے سوات اور بونیر کے علاقے انگریز کی دست برد سے محفوظ رہے۔ فرنگی کو اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ امبیلہ میں اس مقام پر جہاں حضرت اخون صاحب کا قیام تھا ایک خوب صورت مسجد تعمیر کر دی گئی ہے جو آج بھی ہمیں جہاد امبیلا کی یاد دلاتی ہے۔

۵ر جنوری ۱۸۶۴ء کو انگریزی لشکر واپس پشاور چلا گیا۔ اس لڑائی میں اس کے ایک ہزار کے قریب سپاہی اور افسر ہلاک اور زخمی ہوئے ـــ انگریز نے

اپنی اس خفت کا بدلہ یوں لیا کہ ان تمام ہندوستانی مسلمانوں پر، جو مجاہدین کی مالی امداد کیا کرتے تھے، مقدمات قائم کر دیے۔ خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں بہت سے سرکردہ لوگوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ اس طرح مجاہدین بے یار و مددگار رہ گئے۔

۲ راگست ۱۸۶۸ء کو زید اللہ خان نے ایک سواتی سوداگر کو لوٹ لیا۔ حضرت اخوند نے اس کی تلافی کے لیے ایک لشکر زید اللہ خان کے مقابلے کو بھیجا۔ قدرت کا انتقام دیکھیے کہ اخوند صاحب کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے اسی ریوالور سے زید اللہ خان کا خاتمہ کر دیا، جو انگریزوں نے اسے انعام کے طور پر دیا تھا۔

حضرت اخوند صاحب سوات نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے سوات و متعلقات کو انگریزوں کے اثر و نفوذ سے آزاد رکھا۔ انگریز کو کوئی ایسا بہانہ مہیا نہ کیا جس کی بناء پر وہ جنگ چھیڑ سکے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ "اخوند صاحب ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو قبائل میں حیرت انگیز رسوخ رکھتی تھی"۔ سید جمال الدین افغانی نے بھی "البیان" کے تتمے میں اخوند صاحب کے زہد، ان کی پاکیزگیٔ اخلاق، ان کے شوقِ جہاد اور حریت پسندی کی بڑی تعریف کی ہے۔ پادری ہیوز (HUGHES) تک نے ان کی کرامات کو تسلیم کیا ہے۔

ان کے اسی اثر و رسوخ اور اسلامی خدمات کا نتیجہ تھا کہ جب سوات میں ایک آزاد قومی اور اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تو اخوند صاحب ہی کے اخلاف کو اس کا سربراہ چنا گیا۔

باہمی تنازعات اور دیر کے ساتھ معرکوں کے باعث جب سرزمینِ سوات بدنظمی کا شکار ہو گئی تو تمام قبائل کا ایک مشترکہ جرگہ نیکی خیل کے علاقہ میں کبل کے

مقام پر بلایا گیا۔ سب قبیلوں نے بالاتفاق نومبر ۱۹۱۸ء میں اخون صاحب سوات کے پوتے میاں گل عبدالودود کو سوات کا بادشاہ منتخب کر لیا۔ میاں گل نے سوات میں ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی اور علاقے میں امن و امان بحال کیا۔ چنانچہ ۳ مئی ۱۹۲۶ء کو حکومت برطانیہ نے باقاعدہ طور پر ریاست سوات کو تسلیم کر لیا اور میاں گل عبدالودود اس کے پہلے والی قرار پائے۔ ۶۳ سال کی عمر کو پہنچنے پر میاں گل صاحب نے عنانِ حکومت اپنے فرزند میاں گل عبدالحق جہاں زیب کے حوالے کر دی۔ نئے والئ سوات نے ریاست کو ہر طرح سے ایک ترقی یافتہ اور جدید ریاست بنا دیا۔ ۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو حکومت کے ایک فرمان کے مطابق ریاستیں ختم کر دی گئی ہیں اور سوات کو صوبہ سرحد کا ایک ضلع بنا دیا گیا۔

یہ حضرت اخون صاحب سوات ہی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ ان کے خلفاء نے بھی اسلامی جہاد کو اپنا دستورِ حیات بنائے رکھا، چنانچہ حضرت نجم الدین ہڈہ ملا صاحب، سعد اللہ خان المعروف سرتور فقیر، منڈاکئی ملا صاحب اور حضرت پیر عبدالوہاب مانکی شریف نے اپنے عظیم مرشد کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑا کام کیا اور ان حضرات نے بھی اپنے پیر و مرشد کی طرح بڑی شہرت پائی۔

قطب الاقطاب، غوثِ زمان، رئیس المجاہدین حضرت اخون عبدالغفور بابا نے ۱۲ جنوری ۱۸۷۷ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ فرمایا۔ ان کا مزار اب بھی سیدو شریف میں مرجع خاص و عام ہے۔

